کشمیر کے نوجوان اردو قلمکار

ایک درخشاں مستقبل کے ضامن

ڈاکٹر مشتاق حیدر

انسانی زندگی میں بڑا تنوع ہے۔ یہی تنوع انسان کو مجبور کرتا ہے کہ زندگی میں دلچسپی لے اور اس کا اظہار کرے۔ اگر یہ اظہار خلاقانہ طریقے سے ہو تو یہ پُر اثر بھی ہوتا ہے اور دیر پا بھی۔ ایسے خلاقانہ طریقوں کو ہم فنونِ لطیفہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ جن میں سے ایک ادب بھی ہے۔

ادیب کی قوتِ تخیل عام آدمی سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہ محض خیالات اور الفاظ کے درمیان ایک رسمی رشتہ یا رابطہ ہی قائم نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی قوتِ متخیلہ کے بل پر اس میں کچھ اور یا بہت کچھ شامل کرتا ہے۔ ادیب عام آدمی سے زیادہ اشیاء کی گہرائی تک پہنچتا ہے۔ وہ باتیں جن سے عام آدمی صرفِ نظر کرتا ہے، ادیب کی نظروں سے بچ کر نکل نہیں سکتیں۔ وہ تجربہ جو عام آدمی کے لیے معمولی بات ہے، ادیب کے لیے ایک ایسا قطرہ ہے جس میں دریا نظر آجاتا ہے۔ ادیب اپنے تجربات کو جذبہ و احساس کی بھٹی میں پکا کر قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ ادب میں ہمیں ذہین ترین دماغوں کی خوش بیانی اور اُن کی فصاحت

نظر آتی ہے، جو تحریر کی شکل میں زمین و زماں کی رُکاوٹوں کو پار کرتی ہوئی ہم تک پہنچتی ہے۔

مشہور نقاد ہڈسن نے ادبی تخلیقات کے وجود میں آنے کے اسباب پر نظر ڈالتے ہوئے اُنہیں تین ذمروں میں تقسیم کیا ہے۔ ہڈسن کے تجزیے کے مطابق ادب کے وجود میں آنے کے چار اسباب ہیں:

(اوّل) انفرادی اظہارِ خیال: یہ انسانی فطرت کا خاصا ہے کہ وہ اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ انسان (تخلیق کار) اپنے خیالات کو موثر طریقے سے دوسروں تک پہنچانے کے لیے جب الفاظ کو ایک خاص ہئیت میں ڈھالتا ہے تو ادب وجود میں آتا ہے۔

(دوئم) انسانی زندگی سے دلچسپی:۔ ادیب / فنکار کا دل صحیح معنوں میں جامِ جم ہے، جس کے اندر اُسے سب کچھ نظر آتا ہے، یہاں اپنی فکر کی جھلملاہٹ تو خیر نظر آتی ہی ہے، ساتھ ہی سماج کا ایک فرد ہونے کی بنا پر اس جامِ جم میں سماج سے وابستہ دیگر افراد کے تجربوں، مسائل اور اعمال کا بھی عکس نمایاں ہوتا ہے۔ فنکار اپنی شخصیت کو ان تجربوں سے ہم آہنگ کر کے تخلیقی تجربے کی شکل میں سامنے لاتا ہے۔

(سوئم) ملک، قوم یا وطن اور دنیا سے محبت:۔ ایک سماج کا حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ فنکار ملک و قوم کا ایک جز بھی ہوتا ہے اور یہ فنکار حب الوطنی، قومی ترقی، امن اور جنگ، رنگ و نسل، سیاست و سماج سے جذباتی طور پر اثر قبول کرتا ہے اور نتیجے میں اپنی خلاقیت کی بنا پر اس صورت حال اور جذبے کو تخلیقی تجربے کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

(چہارم) مخصوص صنفِ ادب سے دلچسپی:۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی صنف یا ہئیت کسی تخلیق کار کے جمالیاتی شعور کو اس طرح مہمیز کرتی ہے کہ وہ صرف اُسی مخصوص ہئیت یا صنف میں اپنی تخلیقی اُپج کا اظہار کرتا ہے۔

یہ تو مختصر سی بات ہوئی کہ ادبی تخلیقات کے وجود میں آنے کے اسباب کیا ہوتے ہیں۔ پھر جب یہ ادبی تخلیقات منصۂ شہود پر آتی ہیں تو اِن کی تشکیل میں کئی عناصر شامل ہو جاتے ہیں۔ ہڈسن نے مواد کے علاوہ ایسے دیگر عناصر کو بھی چار خانوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) عقلی و ذہنی عناصر (۲) جذباتی عناصر (۳) تخیلی عناصر (۴) تکنیکی و فنی عناصر

عقلی اور ذہنی عناصر کی بابت ایسا کہنا کافی ہے کہ کسی بھی سنجیدہ ادب پارے کی تخلیق فکری عنصر کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ فکری عنصر کے بغیر ادب پارے کی مثال ایک ایسے جسم کی ہے کہ جو حسین تو ہے مگر بے جان!

ترسیلِ کیفیت و خیال کے لیے ضروری ہے کہ فنکار جو بات یا تجربہ جس کیفیت کے اثر کے تحت بیان کرے وہی کیفیت قاری پر بھی طاری ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ادیب جذبات سے سرشار ہو کر ادب کی تخلیق کرے۔ یعنی جذباتی عنصر ادب پارے کی کامیاب ترسیل کا ضامن ہوتا ہے۔

اس بات کی بھی کافی اہمیت ہے کہ قاری بھی ادیب کی پروازِ خیال کا ساتھ دے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ادب پارے میں ادیب کے تخیل کی ذرخیزیت اپنا کام کر گئی ہو۔

مذکورہ بالا تینوں عناصر مواد کی تشکیل میں مدد کرتے ہیں لیکن مواد کو ایک واضح اور منفرد وجود فراہم کرنے کے لیے اِسے کسی مخصوص ہئیت میں ڈھالنا ناگزیر بن جاتا ہے۔ یہ مرحلہ فنی و تکنیکی عناصر کی شمولیت سے طے ہوتا ہے۔

جہاں اول الذّکر عناصر ثلاثہ یہ بتاتے ہیں کہ ادب پارے میں کیا کہا گیا ہے وہاں مؤخر الذّکر عنصر یہ بتاتا ہے کہ کیسے کہا گیا ہے۔ اس مختصر سی تمہید کی روشنی میں اگر اصل موضوع کی طرف مراجعت کریں اور ریاست جموں و کشمیر کے نوجوان اردو شعراء کی نگارشات کا سرسری ہی جائزہ لیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے نوجوان اردو

شعراء اِس بُتِ ہزار شیوہ کے عاشق صادق ہی نہیں طالبِ باعمل بھی ہیں۔ ان تمام عناصر اور اسباب میں کوئی نہ کوئی سبب یا عنصر اپنی مخصوص شکل وصورت میں ہر شاعر کے کلام میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔

ہمارے نوجوان اردو شعراء غزل، نظم ہی نہیں بلکہ رباعی و مرثیہ کے میدان میں بھی پامردی سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ اسی طرح منثور ادب کے مختلف مظاہر مثلاً ناولٹ، مختصر افسانہ، انشائیہ، روزنامچہ اور رپوتاژ نگاری میں بھی ہمارے نوجواں ادباء اردو کے ادبی حلقوں میں اپنا نام درج کروانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

فی زمانہ تحقیق وتنقید کے اصول وضوابط سیال شکل اختیار کر گئے ہیں۔ ایک محقق اور ناقد کے لیے اس بہتے دریا کی روانی کے ساتھ اپنی رفتار بنائے رکھنا از حد ضروری ہے بھی ہے اور مشکل بھی۔ البتہ خوشی اور طمانیت کی بات یہ ہے کہ ہماری ریاست کے نوجوان ناقدین ومحققین اس صورت حال سے نہ صرف باخبر ہیں بلکہ اپنے آپ کو اِس مزاج ومنہاج سے بھی کامیابی کے ساتھ ہم آہنگ کر پائے ہیں۔

آیئے ہماری ریاست کے نوجوان اردو شعراء کی طرف اپنی گفتگو کا رُخ موڑتے ہیں۔ ہمارے نوجوان شعراء مواد اور فن ہر دو سطح پر مہارت کا ثبوت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ جن نوجواں شعراء پر راقم نے خامہ فرسائی کی ہے ان میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی یوں ہیں: شیخ خالد کرار، علمدار عدم، سلیم ساغر، غضنفر علی شہباز، غلام نبی غافل، قتیل مہدی، رؤف راحت، ع ع عارف، سید لیاقت نیّر، اقبال صدیقی، محتشم احتشام، احمد پاشا جی وغیرہ۔

جہاں قتیل مہدی اور احمد پاشا جی جیسے نوجوان اردو شعراء اردو تہذیب و ثقافت کے اندر پائے جانے والے درویشانہ اور متصوفانہ افکار و خیالات کو پوری توانائی کے ساتھ ادا کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ وہیں شیخ خالد کرار، ع ع عارف اور علمدار عدم جیسے نوجواں شعراء جدید لب ولہجے کو وقار بخشتے نظر آرہے ہیں۔

اسی طرح سلیم ساغر، سید لیاقت نیّر، محتشم احتشام، یاسین سمبلی اور رؤف راحت سے اگر کوئی شخص بالمشافہ نہ ملا ہو تو اُن کا کلام پڑھ کر اُسے یہ گمان گزر سکتا ہے کہ یہ لوگ ایسے صاحبانِ نظر ہیں جنہوں نے دشت زندگانی میں بہت صحرانوردی کی ہے اور اب عمر کے آخری پڑاؤ پر ستانے کے ساتھ ساتھ تجربہ و تخیل کے رنگوں سے حسین اور گہرے معانی کی تصویریں بنا رہے ہیں۔

اردو ادب میں مستعمل صوفیانہ مضامین اور درویشانہ فکر کشمیری رشیت کے فلسفے سے ذرا مختلف ہے۔ اردو ادب میں تصوف ایک شعری روّیہ کے طور پر برتا گیا ہے۔ جس کی اپنی ایک نظریاتی اساس ہے اور جس کی پشت بان گنگا جمنی تہذیب ہے۔ ہمارے نوجوان اردو شعراء دونوں فلسفوں کے درمیان کے اُس نازک فرق کو بہ خوبی سمجھتے ہیں جس کا ہمارے یہاں کے کئی بزرگ ادباء ماضی میں ادراک نہیں کر پائے۔ میرے دعوے کی دلیل کے طور پر یہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن سے خالص اردو/فارسی شاعری میں برتے گئے تصوف کے روّیے کی سوندھی سوندھی مہک آ رہی ہے۔

نقشِ ہستی بگاڑ کر دیکھوں
پردۂ جاں کو پھاڑ کر دیکھوں
کیا کسی اور کو میں دوں الزام
اپنا دامن ہی جھاڑ کر دیکھوں
وہ نہیں ہے تو سوچتا ہوں میں
شہرِ الفت اُجاڑ کر دیکھوں
قبر میں کیا حساب لیتے ہیں
خود میں خود کو ہی گاڑ کر دیکھوں
جو فہم سے پرے ہے وہ دنیا

اے قتیلؔ اب میں تاڑ میں دیکھوں

(قتیلؔ مہدی)

ہمارے ایک اور نوجواں شاعر احمد پاشا جی کے یہاں بالکل اُسی طرح وارداتِ قلبی کا بیان نظر آتا ہے جو اصغر گونڈوی یا میر دردؔ کے متصوفانہ کلام کا جوہر ہے۔ میں اُن عظیم شعراء سے احمد پاشا جی کا موازنہ قطعی نہیں کر رہا ہوں البتہ احمد پاشا جی کو اُسی راہ کا تیز رَو راہی کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں ہے۔ اگر چہ فنی سطح پر پاشا جی کو ابھی کئی ہفت خواں طے کرنے ہیں۔ اس پسِ منظر میں پاشا جی کے چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

بڑے تپاک سے ہم اہتمام کرتے ہیں
کہ کار رندِ بلا نوش عام کرتے ہیں
اگر چہ صبح کا تارا ہے تو !عجب کیا ہے؟
عجب ہے ہم تیری زلفوں میں شام کرتے ہیں
جناب قیس کو دیکھا نہیں، سُنا بھی نہیں
دیارِ عشق میں ہم بھی قیام کرتے ہیں
زمینِ شاعرِ مشرق ہے یہ تو پاشا جیؔ
اسی جگہ پہ غزل کو تمام کرتے ہیں

(احمد پاشا جیؔ)

اسی قبیل سے تعلق رکھنے والے نوجوان شاعر فاروق فداؔ کے چند شعر بھی ملاحظہ کیجیے:

دوئی گمراہ کرتی ہے ذہن جب خام ہوتا ہے
نظر کے واسطے ہر شے میں اک پیغام ہوتا ہے

مختصرؔ سا کام کرے گا نظر لے جائے گا
بس وہی جو تیرے اندر اور باہر ہے بسا

ہے یہی شیوہ ازل سے وہ ہواؤں کے عوض
بے خبر بن کر تیرے سب بال و پر لے جائے گا

(فاروق فدا)

اگر چہ دنیا سمٹ کر ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے اور سیاسی سطح پر فکر و فلسفہ کی ایک عالمگیر شکل سامنے لانے کی کوششیں کی جارہی ہیں لیکن پس مابعد جدید ادبی نظریہ کا زور اس بات پر ہے کہ ادب و ادیب کتنا بھی عالمی مسائل کو اپنے فن پاروں میں برتے، ہر فن پارے کی جڑیں اپنی ثقافت میں ہی پیوستہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ سامعین اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ پچھلی صدی کی نویں دہائی سے خطۂ کشمیر ایک خوں آشام دور سے گزر رہا ہے۔ یہاں کے نوجواں شعراء کی تخلیقات میں بھی اس درد و کرب نے راہ پائی ہے جو اِس زمین کے باشندوں کا مقدر بن گیا ہے۔ اس سلسلے میں نوجواں شاعر شبیہ الحسن قیصر کے یہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اسیری مجھ پہ کیسی چھا رہی ہے
ہوا زنجیر سی پہنا رہی ہے
ذہن میرا نہ جانے قید کب سے
تصور خامشی برسا رہی ہے
ہے پاگل دیر سے چپ سوچ کر یہ
طبیعت اور بھی گھبرا رہی ہے
عہد نامہ پُرانا ہو گیا ہے
شبِ اُمید ڈھلتی جا رہی ہے
بس اک شجرہ ہے کُل میرا اثاثہ
اُسے بھی ایک دیمک کھا رہی ہے

(شبیہ الحسن قیصرؔ)

اس طرز کی شیخ خالد کرار کی ایک مختصر نظم بعنوان 'خوں بہا' ملاحظہ کیجیے:

'خوں بہا'

ہوا جب شور کرتی ہے
تو لگتا ہے
خلا میں ایکا ایکی کروڑوں لوگ چیخے ہوں
ہوا جب شور کرتی ہے
رگ و پے میں
عجب سا خوف آسیب بن کر دوڑتا ہے
ہوا جب شور کرتی ہے
تو لگتا ہے
ہزاروں سال سے سوئی ہوئی روحیں
بیدار ہو کر
چیختی ہیں
اور اپنا خوں بہا مانگتی ہیں

(شیخ خالد کرار)

یہاں کچھ نہ کہہ کر سب کچھ کہنے والا انداز اپنایا گیا ہے۔ یہ وہی پس مابعد جدیدیت والا انداز ہے کہ تخلیق کی جڑیں تو اپنی زمین میں پیوست ہیں لیکن شاعر تمام عالم کے مستضعفوں کے درد و کرب کے اظہار میں کامیاب ہوا ہے۔ اس نظم کی مغموم فضا صرف خطۂ کشمیر سے ہی علاقہ نہیں رکھتی بلکہ یہ فضا فی الوقت نصف سے زیادہ عالم پر چھائی ہوئی ہے۔

حرف وصوت کے اسی قبیلے سے متعلق نوجواں شاعر رؤف راحت کے چند

اشعار ملاحظہ کیجیے:

تمنا ہو چکی ہے خاک جل کر
ملے گا کیا مجھے اب ہاتھ مل کر
ہمارا تجربہ کس کام آیا
لگی ہے آج پھر ٹھوکر سنبھل کر
سنا ہے رات بھی ڈھلنے لگی ہے
کبھی دیکھا نہیں گھر سے نکل کر
بہا کر خون کے دریا گلی میں
پھرا کرتا ہے وہ چہرہ بدل کر
ابھی زندہ ہے راحت شکر للہ
گیا تھا وہ ہمیں ورنہ کچل کر

(رؤف راحت)

یہ اور اس طرح کے دیگر اشعار اُس شعری کردار کے دل کا حال کامیابی کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو تمام عالم کے مستضعفوں کا نمائندہ بن گیا ہے۔ فنی خوبصورتی اور صناعی کا عالم یہ ہے کہ اشعار میں فعل تو واضح ہے مگر فاعل غائب۔ بات دراصل یہ ہے کہ جس زمانے میں ہم آپ اور ہمارا عصری شاعر رہ رہا ہے یہ زمانہ بے چہرہ لوگوں کا زمانہ ہے، اور ہماری ریاست کے بیشتر نوجوان شاعر اس حقیقت کو بہ خوبی سمجھتے ہیں۔ انگریزی تنقید میں دو جملے بہت زیادہ استعمال کیے جاتے ہیں اوّل A writer writes of his times دوم Art is immortal۔ بظاہر یہ دو جملے متضاد معنی کے حامل نظر آتے ہیں لیکن ذرا غور کریں تو ایک اچھے ادب پارے میں پائی جانے والی معنی کی بوقلمونی اور صداقت کی پائیداری اِن ہی خصوصیات کی وجہ سے پیدا ہوسکتی ہے۔ زمین وزمانہ کے مسائل تخلیق میں صداقت کے عناصر کو قوی کر دیتے ہیں

اور فنکاری اس تخلیق کو دیرپائی عطا کرتی ہے۔

اردو دنیا کو ہمارے یہاں کے شاعروں سے برسوں تک یہ گلہ رہا ہے کہ انکے اشعار میں فکر کی گہرائی کم کم نظر آتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے کئی نوجواں شعراء کا کلام دیکھ کر یہ گلہ ضرور دور ہوگا۔ دعویٰ کی دلیل کے طور پر نوجوان شاعر علمدار عدم کے چند شعر مشت از خروارے پیش کر رہا ہوں۔

آنے والی ہر گھڑی احساس دیتی ہے مجھے
میں گریزاں لمحۂ بیزار کے قابل نہیں
مجھ سے برگشتہ ہوئی ہر شے تمہارے شہر کی
میں جو چاہوں موت بھی تو دار کے قابل نہیں
یہ تیری آنکھیں لب و رخسار یہ ناز و ادا !
داد کے قابل ہیں لیکن پیار کے قابل نہیں

ے

حصارِ ذات میں رہنے کی سزا ہے جیسے
شعورِ زیست لگے ہے خفا خفا جیسے
یہی تو بات ہے میری زمیں کی مٹی میں
میں گھوم پھر کے وہیں پھر سے آ گیا جیسے

ے

سیاہی عمر بھر میرے تعاقب میں رہے گی
کہ میں نے جسم کو قرطاس سے باندھا ہوا ہے
ہمارے بعد ان آبادیوں کی خیر کیجو
سمندر ہم نے اپنی پیاس سے باندھا ہوا ہے

اردو غزل کو جس وصف نے غزل دشمنی کے دور میں بھی زندہ رکھا وہ فکر و غنا

کا حسین امتزاج ہے۔غزل اگر چہ غنائی شاعری ہے مگر اِس طائرِ غنا کو فکر کے پَر دو عالم کی سیر کراتے ہیں۔ ہماری ریاست کے کئی نوجواں شعراء اس حقیقت کا سراغ پا گئے ہیں۔غزل کی اس قوی روایت سے جڑے ہوئے چند نوجواں شاعروں کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہر درد کیا اس نے مرے نام سے منسوب
الفت میں مری ذات ہے الزام سے منسوب
میں ریت کا گھر روز بناؤں سرِ ساحل
قسمت نے کیا مجھ کو یہ کس کام سے منسوب
یہ سوچ رہا تھا کہ مری آنکھ بھر آئی
کیا کیا نہ خطا ہے دلِ ناکام سے منسوب
باطن کی صفائی ہو بیاں نوکِ قلم سے
پھر شعر ہوا کرتا ہے ابہام سے منسوب

(سلیم ساغر)

سہلِ ممتنع اردو غزل کی ایک ایسی خوبی ہے جس نے اِسے عصری معاشرے میں ہر دلعزیز بنائے رکھا ہے۔سہلِ ممتنع کی خوبصورت مثالیں ہمیں حسرت موہانی کے دور سے ملنی شروع ہوتی ہیں۔ ریاست کے ایک نوجواں شاعر غضنفر علی شہبازؔ کی اسی صفت سے متصف ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

ہم اُن سے شکایت کر نہ سکے
ہم ترکِ روایت کر نہ سکے
اشکوں کے بنائے شیش محل
پر رنج کو راحت کر نہ سکے
ہم ہجر میں ہر پل جلتے رہے

ہم وصل کی چاہت کر نہ سکے
اوروں پہ کرم ہر وقت رہا
ہم پر وہ عنایت کر نہ سکے
اشکوں کے گُہر لٹتے ہی گئے
کچھ اس میں کفایت کرنہ سکے
واعظ تو ہمیں سمجھاتے رہے
پر خود کی ہدایت کر نہ سکے
شہبازؔ بتوں کی بستی میں
ہم کوئی کرامت کر نہ سکے

(غضنفر علی شہبازؔ)

امیجری اردو شاعری خصوصاً اردو غزل کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ یہ امیجری کا فن ہی ہے جس نے اردو شاعری کو سمعی و بصری دونوں ذرائع تفنن کے لیے ناگزیر بنا دیا ہے۔ ہمارے یہاں کے کئی نوجواں شاعروں کی غزلیں اسی صفت سے متصف نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے سب سے پہلے ع ع عارف کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

خوش نما منظر یہاں کوئی نہیں
خوشبوؤں کا گھر یہاں کوئی نہیں
کس کے سر رکھیں کلاہِ فخر ہم
جب مقدس سر یہاں کوئی نہیں
ٹوٹ کر بکھرے پڑے ہیں آئینے
دور تک پتھر یہاں کوئی نہیں

(ع ع عارفؔ)

اسی سلسلے میں ایک اور نوجواں شاعر محتشم احتشام کے چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

ہر طرف دربدر تھی تنہائی
میں تھا اور ہمسفر تھی تنہائی
تھی یہ آبِ حیات میرے لیے
کیسے کہہ دوں زہر تھی تنہائی
کوئی سایہ نہ دوست نہ دشمن
ساتھ چاروں پہر تھی تنہائی

(محتشم احتشام)

ایسے مضامین کو اگر محاکاتی انداز سے پیش کیا جائے تو الفاظ لافانی ہو جاتے ہیں۔ یہ کرشمہ کر دکھانے کا ہنر ہمارے دو نوجواں شاعروں غلام نبی غافل اور سلیم ساغر کو خوب آتا ہے۔ پہلے غلام نبی غافل کی ایک غزل سے مذکورہ موضوع کی ترسیل کے لیے امیجری کے فن کارانہ انداز ملاحظہ کیجیے۔

گنبدِ بے در پہ اک در کا نزول
روزِ محشر اور پیمبر کا نزول
عقل ہائے فکر پرور کا نزول
وادیٔ گل بادِ صرصر کا نزول
چلتے پھرتے پتھروں کی ہے دعا
ذر اُگلتے دستِ آزر کا نزول
فصل ہے یہ کُشتِ جسم و جان کی
آسماں سے تو نہیں شر کا نزول
سب دھڑوں کو لا کے اک محور پہ رکھ
عینِ ممکن ہے کہ ہو سر کا نزول
کتنی صدیوں سے چُکایا جائے گا

آہِ اصغرؔ پر یہ خنجر کا نزول
یاد رکھ غافلؔ بھرے بازار میں
بالیقیں ہے ایک دن گھر کا نزول
(غلام نبی غافلؔ)

سلیم ساغر کے چند غزلوں سے اسی فنکاری کے نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

اُترا ہے دل میں یاد کا خنجر تمام رات
عالم رہا ہے صورتِ محشر تمام رات
خاموش سب ہوئے تو سماں بولنے لگے
منہ میں زبان رکھتے ہیں منظر تمام رات
توحید کی کرن سے صنم منہ کے بل گِرے
رویا صبح ، تراش کے آزر تمام رات
الجھے شکن ، شکن میں کنوارے جو خواب تھے
خالی پڑی رہی ہے جو چادر تمام رات
جلتا رہا کبھی تو کبھی بجھ کے رہ گیا
اِک آرزو میں شمع سا پیکر تمام رات
گلشن کی چاہ کیسے سنگستاں میں لے گئی
دن کو لگے جو پھول وہ پتھر تمام رات

(سلیم ساغر)

ہمارے نوجواں مصنفین شاعری کے ساتھ ساتھ منثور ادب خاص کر صنف افسانہ میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں۔ ہماری ریاست کا افسانہ نگار اور اردو فکشن کے ناقدین ہمیشہ ایک دوسرے سے دور دور رہے ہیں۔ اس سلسلے میں دونوں طبقے الزام ایک دوسرے کے سر ڈالتے ہیں۔ ریاست کے فکشن نگاروں کا گلہ

یہ رہا ہے کہ اردو دنیا کے فکشن ناقدین اُن سے متعصّبانہ روّیہ روا رکھے ہوئے ہیں اور فکشن ناقدین کا کہنا ہے کہ ابھی جموں و کشمیر کا فکشن باقی اردو دنیا کے فکشن کے دھارے سے ہم آہنگ نہیں ہو پایا ہے۔

اسی پوری صورت حال پر غور کرنے پر میرے ذہن میں دو چیزیں آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ ادب کی دیگر اصناف کے مقابلے میں فکشن زبان و بیان، محاورہ و روزمرہ پر تخلیق کار کی خاصی دسترس کا متقاضی ہے۔ چونکہ اردو ہماری مادری زبان نہیں ہے اس لیے اس میدان میں کمی یا کمزوری ایک فطری امر ہے۔

دوئم یہ کہ فکشن نگار کا مشاہدہ بہت وسیع ہونا چاہیے، خصوصاً اُس لسانی گروہ کے معاشی، معاشرتی، سیاسی اور سماجی مسائل کی پوری واقفیت ہونی چاہیے جس زبان میں فکشن لکھا جا رہا ہے۔ مذکورہ دونوں سطحوں پر تخلیق کار تب کامیاب ہوسکتا ہے جب اُسے اہل زبان کے ساتھ بات کرنے اور اُس سوسائٹی کے ساتھ میل جول رکھنے کا موقعہ فراہم ہو۔ ہمارے پیش روؤں کو جغرافیائی بُعد نے ان دونوں چیزوں سے کسی حد تک محروم رکھا تھا۔ لیکن فی زمانہ رسل و رسائل کی فراوانی اور خصوصاً اطلاعاتی تکنالوجی نے ہمارے نوجوان فنکاروں خصوصاً فکشن نگاروں کے لیے ان مسائل کا سد باب نکالا ہے۔ جس کے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہو رہے ہیں۔ اب ہمارا نوجوان فکشن نگار نہ صرف باہر پڑھا جا رہا ہے بلکہ سراہا بھی جا رہا ہے۔ اس میدان ابھی اگرچہ ہمیں جھنڈے گاڑنے باقی ہیں لیکن اُمید یہی کی جا رہی ہے کہ اردو فکشن کے کارواں کی باگ دوڑ بہت جلد کشمیر کے فکشن نگاروں کے ہاتھوں میں ہوگی۔

فکشن نگاروں کی ہماری نوجوان پود میں کئی ایسے نام ہیں جن سے ہم اُمیدیں وابستہ رکھ سکتے ہیں۔ ایثار کشمیری، طارق شبنم، ملک ریاض فلک، ناصر ضمیر، نکہت نظر، ریاض توحیدی، ایوب شبنم اس کہکشاں کے چمکتے ستارے ہیں۔

ایثار کشمیری کے تازہ افسانوی مجموعے 'کرب ریزے' میں شامل افسانے

پڑھنے کے بعد یہ بات اظہر من الشّمس ہو جاتی ہے کہ ایثار نے اگر اسی طرح مشق سخن جاری رکھی تو بہت جلد اُن کا نام صاحبِ کمال افسانہ نگاروں میں گنا جائے گا۔ان کے افسانوں کی زبان تصنع سے بالکل پاک نظر آتی ہے جو کہ ایک کامیاب افسانے کے لئے لازمی صفت ہے۔ان کے افسانوں کے موضوعات سماج کے مڈل کلاس طبقے کی خواہشیں، تمنائیں، حسرتیں، غم، خوشیاں اور مسائل و مصائب ہیں۔ ایثار کے افسانوں کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اُن میں اُمید ورجا کی ایک روشن کرن بھی نظر آتی ہے۔ افسانے بعنوان' اندھیری رات کا مسافر، واپسی، ملن، اُمید اور آخری سبق اُن کے نمائندہ افسانے ہیں۔

ریاض توحیدی کے افسانوی مجموعوں' کالے دیوں کا سایہ' اور' کالے پیڑوں کا جنگل' میں شامل افسانے عالمی سطح پر انسانی حقوق کی پائمالیوں پر ایک حساس فنکار کے واویلا کے اظہار پارے ہیں۔توحیدی کا ماننا ہے کہ یہ دنیا تبھی پھر سے جنت کا نمونہ بن سکتی ہے جب ہم اپنے اسلاف کے طریقہ سے منسلک ہو جائیں گے، جس سے ہم کب کے کٹ چکے ہیں۔ ریاض توحیدی زبان پر گرفت کو آہستہ آہستہ مضبوط کر رہے ہیں۔اُن سے بہتر افسانوی ادب کی توقع ہے بشرطیکہ وہ زود نویسی سے خود کو بچائیں۔

ریاست کے نوجوان افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ناصر ضمیر کا ہے۔ناصر کے موضوعات وادی تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ اُن کا کینوس عالمی سطح کے مسائل کو محیط ہے۔ ناصر نے کرشن چندر کے کالو بھنگی کی طرح کے کئی افسانے لکھے ہیں جنہیں میں شخصی افسانوں سے تعبیر کروں گا۔یعنی کسی شخص کی ذات کو مرکز بنا کر انسانی اور کائناتی مسائل کا فنکارانہ اظہار افسانے کی ہئیت میں کرنا۔ان کے ایسے افسانوں میں زون (حبہ خاتون کی ذات اور شخصیت پر افسانہ)، یادوں کا موسم (عمر مجید کی ذات اور شخصیت پر افسانہ)، آوارگی (مجاز کی ذات اور شخصیت پر افسانہ)، منٹو کہانی (سعادت حسن منٹو

کی ذات اور شخصیت پر افسانہ) قابلِ ذکر ہیں۔ ناصر کا یہ منفرد انداز و اظہار اُن کے فن پاروں کی دیرپائی میں ایک اہم مدد و معاون ثابت ہوگا۔

نوجوان افسانہ نگار ملک فلک ریاض نے منی افسانے لکھ کر اپنی آمد کا توانا احساس دلایا ہے۔ منٹو کے بعد اکثر افراد نے منی افسانے لکھنے کی کوششیں کی لیکن اُن کی بیشتر تحریریں ایک کالمی خبر کی شکل سے آگے بڑھ نہ پائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ منی افسانہ لکھنا عمومی طوالت کے افسانے سے بہت زیادہ مشکل کام ہے۔ لیکن ملک فلک ریاض نے منی افسانے کو پوری فنکاری کے ساتھ برتا ہے اور بہت ہی خوبصورت فن پارے سامنے لاکر قارئین سے داد و تحسین بھی پائی ہے اور پا رہے ہیں۔ ملک فلک ریاض کی اختصار پسندی اُنہیں ریاست کے اردو افسانے میں بہت جلد ایک منفرد مقام دلائے گی۔ شرط یہ ہے کہ وہ یونہی مشقِ سخن جاری رکھیں۔

ریاست کے نوجوان افسانوں نگاروں میں چند ایک سال پہلے رافعہ ولی کے نام کا اضافہ ہوا جنہوں نے اپنی زوردار آمد سے قارئین کو چونکا دیا۔ وہ افسانہ 'کھیت' کے ساتھ میدان میں اُتریں اور لگاتار نئی نئی تخلیقات سے میدان میں ڈٹی ہوئیں ہیں۔ میں ریاست کے افسانوی اُفق پر اُن کے تاباں مستقبل کی پیش گوئی کر رہا ہے۔ رافعہ ولی کے ساتھ ساتھ کئی دیگر نوجوان افسانہ نگاروں سے ہماری اُمیدیں وابستہ ہیں جن میں چند نام یوں ہیں: طارق شبنم ،زبیر قریشی، سہیل سالم، بلقیس مظفر، شہزادہ سلیم وغیرہ

ریاست کے ہمعصر افسانوی منظر نامے پر بہت سارے افسانہ نگار ستاروں کی مانند روشن و تاباں ہیں۔ لیکن وہ جواں سال ہونے کے باوجود سینئر تخلیق کاروں کے قافلے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے اس مخصوص مضمون میں اُن کے فن پر بات کرنا خلاف ادب ہوگا۔

نثری ادب کی اہم ترین شاخ تنقید و تحقیق میں بھی ہمارے نوجوانوں شمعیں

فروزاں کر رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میدان میں جہاں بہت عرصے تک ہمارے یہاں خلاء پایا جاتا تھا اب ہم خود کفیلی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہمارے نوجوان ناقدین و محققین نے ایسے ان چھوئے موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے اور اُٹھا رہے ہیں کہ ہمارے یہاں ایک ادبی انقلاب کے آمد کا صاف عندیہ مل رہا ہے۔ کشمیر اور جموں کی یونیورسٹیوں میں کی جانے والی سنّدی تحقیق وتنقید سے ہٹ کر بھی ہمارے کئی محققین نے اعلیٰ ادب پارے سامنے لائے ہیں۔ ایسے ناقدین و محققین میں سلیم سالک، ڈاکٹر الطاف انجم، ڈاکٹر عرفان عالم، ارشاد آفاقی، ڈاکٹر شاہ فیصل، ڈاکٹر آصف علیمی، ڈاکٹر فیض قاضی آبادی، جنید جاذب، ڈاکٹر عرفان عارف جیسے نام قابل ذکر ہیں۔ خاکسار بھی کئی برسوں سے وقتاً فوقتاً ادب نوازوں کے سامنے اپنے تحقیق اور تنقیدی مضامین رکھنے کی احمقانہ کوشش کرتا رہتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ گزشتہ صفحات میں پیش کیے گیے منظر نامے کو دیکھ کر قارئین کو یک گونہ اطمینان حاصل ہوا ہوگا کہ ہماری نوجوان پودتندہی اور سنجیدگی کے ساتھ ریاست میں اردو ادب کے شجر کی آبیاری میں منہمک ہے جو کہ ایک روشن ادبی کل کی ضمانت ہے۔

☆☆☆